تصویر
بنادی جائے
مجموعہ غزلیات
سید علی مطہر اشعر

انتساب

میں اپنے سامنے تعبیرِ خواب رکھتا ہوں
زمیں پہ رہ کے کئی ماہتاب رکھتا ہوں

مرا وجود معطر ہے نکہتِ گُل سے
میں اپنی گود میں اکثر گلاب رکھتا ہوں

چند سطور

سید علی مطہر اشعر

قیام پاکستان سے قبل بھی اردو ادب کی آبیاری پنجاب کا وصف خاص رہا ہے، پوٹھوہار کے وسیع علاقے میں ایسے ایسے مشاہیر ادب عالیہ کی پرورش وارتقا میں مصروف رہے ہیں جن پر اردو زبان بولنے والے ہمیشہ فخر ومباہات کے پھول نچھاور کرتے رہیں گے، تاہم پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد نئی نسل کی کاوشیں مزید داد وتحسین کی مستحق ہیں، اس استحقاق کے متعدد پہلو متعین کئے جا سکتے ہیں۔ اولاً تو وہ سیاسی صورت حال جو پاکستان کے طول وعرض پر تا حال مسلط ہے، دوئم وہ معاشی اور معاشرتی ابتری جس نے نہ صرف عصبیت کو فروغ دیا بلکہ طبقاتی ناہمواری وزبوں حالی کو بھی ہوا دی۔

وہ اپنے پورے بدن کی طرف پلٹ نہ سکے
ہوا نے ایسا بکھیرا کہ پھر سمٹ نہ سکے

یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ بالخصوص واہ اور ٹیکسلا کے ادبی حلقوں میں مشاہدے کی تلخی نے کچھ زیادہ ہی حقیقت نگاری کو نمایاں کیا۔ اگر یہاں کے مجموعی ادب کا گہرائی اور غائر النظری سے مطالعہ کیا جائے تو مذکورہ عنصر غالب نظر آئے گا۔ میں خود بھی چھتیس سال کے طویل عرصے تک صنعتی ماحول میں اپنے فرائض منصبی ادا کرتا رہا ہوں میں نے بھی افتراقِ کارِ منصبی کو شدت سے محسوس کیا ہے نیز اسی صورت حال کا پرتو میری شعری اور نثری (افسانہ نگاری) کاوش پر بھی مسلط رہا ہے۔ میں نے انتہائی کوشش کی کہ "زلف وَعارض" کے موضوعات بھی سپردِ قرطاس کروں مگر اس خواہش کو سعئی لاحاصل کے مترادف کہنا مناسب ہوگا۔

ہنوز قصدِ سرِ رہ گذار یار کہاں
کہ پہلے دشتِ مسائل سے تو گذر جائیں

ہماری سعئ مسلسل ہے ریگ ساحل پر
ادھر بنائیں گھروندے اُدھر بکھر جائیں

میری دانست میں شاعری ہر وجود میں پرورش پاتی ہے مگر کچھ لوگ صرف سوچنے کی حد تک اکتفا کرتے ہیں کیونکہ وہ شاعری کے مروجہ اسالیب پر گرفت نہیں رکھتے مگر ہزاروں افراد شاعری کے فن کو سمجھنے اور برتنے کی پوری صلاحیت فطری طور پر محسوس کرتے ہیں اور قلم و قرطاس کا رشتہ بہر طور قائم رکھتے ہیں۔

کہنہ یادیں اس حوالے سے تروتازہ رہیں
زندگی کو سلسلہ در سلسلہ لکھتے رہے

یا

جو باتیں سینوں میں چھپتی رہتی ہیں
ہم اشعر شعروں میں اجاگر کردیتے ہیں

واہ کی ادبی سرگرمیوں میں ایک وقت ایسا بھی تھا جس میں شاعری تو کی جاتی رہی تھی مگر تخلیقی ارتقا کا شعور ناپید تھا یا دانستہ اس رویے سے اجتناب کیا جاتا رہا تھا۔ وہی فرسودہ موضوعات اور استعارے جو گذشتہ دو صدیوں سے اردو غزل سے منسلک چلے آ رہے تھے ان پر مسلسل طبع آزمائی جاری تھی بہر حال اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور میں شاعری کا ذوق رکھنے والے نوجوانوں کو طبع آزمائی کے مواقع پوری طرح میسر آئے نیز بہت مختصر سے عرصے میں ایک اچھا خاصہ اور منفرد ادبی حلقہ عالمِ وجود میں آ گیا۔ اس حلقے میں ظفر ابنِ متین، الیاس، صدا، سجاد بابر، نظیر اختر، احمد جمیل، سبطِ علی صبا، حلیم قریشی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آخر میں ایک بات یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ واہ کے قریۂ نو میں شاہد نصیر، ظہیر رام پوری، اور رازؔ مرادآبادی کی کاوش ادبی ارتقاء کا ناقابلِ فراموش جواز ہیں۔

ایک محنت کش غزل گو۔ سید علی مطہر اشعر

تحریر: پروفیسر ڈاکٹر رؤف امیر

علی مطہر اشعر کی شاعری پر میرے اس مختصر سے مضمون کی حیثیت سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ میں اس کی شاعری کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہ کر پاؤں گا، تاہم اشعر کے اسلوب کے بارے میں میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ وہ اس حد تک منفرد انداز کا شاعر ہے کہ اردو زبان کے ایک کروڑ شاعروں میں اسے پہچاننے میں ہمیں کوئی دقت نہ ہوگی۔

یوں تو اس کی تمام شاعری معاشرتی مسائل کی عکاس ہے لیکن اس کے کچھ بڑے موضوعات گھر، ماحول اور انسانی رشتوں خصوصاً بچوں کے حوالے سے مسائل کی شاعری قابل ذکر ہیں۔ اشعر معاشرتی مسائل کا شاعر ہے اور بالواسطہ طور پر اس کے ہر شعر میں کسی نہ کسی مسئلے کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن کہیں کہیں اس کے لہجے میں اس کا سیدھا سادا اظہار بھی در آیا ہے۔

اور بھی دشت مسائل تھے مرے رستے میں
اک تیری یاد کا تپتا ہوا صحرا ہی نہ تھا

ادھر کہنہ مسائل حل نہیں ہوتے کہ اس جانب
اٹھاتی ہے نئی افتاد سر آہستہ آہستہ

آج کی جدید شاعری میں گھر ایک مستعمل علامت ہے، جیسے چند شعر دیکھئے۔

افتخار عارف

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

محمد اظہار الحق

کرائے کے گھروں میں زندگی گزری ہے اظہار
کہ اپنے گھر ہمارے داستانوں میں بنے ہیں.

جون ایلیا

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

انور مسعود

جس طرح کی ہیں یہ دیواریں یہ در جیسا بھی ہے
سر چھپانے کو میسر تو ہے گھر جیسا بھی ہے

بشیر سیفی

ہیں منتظر مری معصوم چاہتیں سیفی
میں کیوں نہ شام سے پہلے ہی اپنے گھر جاؤں

غرض اس موضوع پر متنوع رنگوں کا ایک طویل شعری سلسلہ موجود ہے اور یہ موضوع بنفسہٖ طویل مقالے کا متقاضی ہے۔ لیکن اشعر نے گھر کے حوالے سے لازوال شعر کہے ہیں۔ اس نے ایک شعر میں زندگی کے منفی اور مثبت پہلوؤں کو یکجا کر دیا ہے۔ اور امید اور نا امید کی کیفیات کو ایک مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ کیا ہمارے اردو ادب میں اس شعر کی کوئی نظیر ممکن ہے۔

وہ پیڑ کاٹ رہا ہے کہ گھر بنائے گا
پرندے سوچ رہے ہیں کہ ہم کدھر جائیں

اوران شعروں میں اس نے معاشرتی تضاد کی کتنی خوبصورت عکاسی کی ہے۔

وہ ماں بھی گنگ ہے جو مجھ کو پھول کہتی تھی
رہِ حیات نے کانٹوں سے بھر دیا ہے مجھے

ماں کے بعد اہم ترین انسانی رشتہ بیوی کا ہے۔ بیوی کے حوالے سے اشعر کا یہ شعر اس کے کھرے پن کی دلیل ہے اور اس کے پس منظر میں اس کے گھر کی مفلسی بین کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

معاشی تنگ دستی میں اور اچھے لباس اور اچھی غذا کی غیر موجودگی میں حسن کملا جاتا ہے لیکن میں تو حیران ہوں کہ اشعر اتنی سچی بات کر کیسے گیا؟

اس کی قسمت جب مری قسمت سے وابستہ ہوئی
پھول سا اس کا بدن تھا سوکھ کر کانٹا ہوا

اشعر کی ایک اور غزل میں عقد اور بہو کے ان الفاظ کے پس منظر میں بھی معاشرتی مسائل اور تہذیبی وثقافتی توڑ پھوڑ کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

اے تیرگی ہم سے تو تیرا عقد ہوا ہے
ظاہر ہے ہمیں چھوڑ کے تو کیسے چلی جائے
اغیار کی تہذیب کو ہم لائے ہیں اشعر
گھر چھوڑ کے اس گھر کی بہو کیسے چلی جائے

بھوک جیسے بڑے سماجی مسئلے پر اگر لاکھوں کتابیں ترازو کے ایک طرف رکھ دی جائیں اور دوسری طرف اشعر کا یہ ایک شعر رکھا جائے تو پھر بھی اس شعر کا وزن زیادہ ہوگا۔

وہ جو اک فاقہ زدہ بچی سے ہم آغوش ہے
کرب کے آثار اس گڑیا کے چہرے پر بھی ہیں

یا پھر کچھ ایسی ہی کیفیت ان شعروں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

پدر کی سوچ میں حائل ہوا تھا بے چارہ
کہ سرخ ہو گیا بچے کا زرد رخسارہ
اک چھوٹے سے سیب کو کتنی قاشوں میں تقسیم کروں
کچھ بچوں کا باپ ہوں اشعر کچھ بچوں کا تایا ہوں

اشعر اپنے بچوں سے بہت پیار کرتا ہے۔اس کی تقریباً ہر غزل میں بچوں کا تذکرہ ضرور ہوگا اور یہی موضوع آج اس کی پہچان ہے۔اشعر کا ایک چھوٹا بچہ فوت ہوا تو اس نے جو شعر کہا، وہ ایک مکمل مرثیہ ہے۔

ہائے وہ غنچہ تازہ کہ ہوا نے نوچا
اب اگر شاخ پہ ہوتا تو گل تر ہوتا

وہ صبح سویرے سورج کی پہلی کرن سے بھی پہلے ڈیوٹی پر جاتا ہے اور جب شام ڈھل جاتی ہے اور پرندے درختوں پر سو جاتے ہیں تو واپس آتا ہے۔یہ سلسلہ کئی سالوں سے جاری ہے۔وہ اوور ٹائم کو بچوں کا حق سمجھتا ہے اور اس کے لئے مشاعروں کی دعوتیں تک ٹھکرا دیتا ہے اس کیفیت میں اس نے خوبصورت ترین شعر کہے ہیں، ملاحظہ ہوں چند اشعار۔

دن بھر کی مشقت نے یہ حال بنایا ہے
مجھ کو میرے بچے بھی چہرے سے نہ پہچانے
بچوں کے تبسم نے بڑا کام کیا ہے
پل بھر کی خوشی کر گئی پہروں کی تھکن دور
پھول سے بچوں میں جب بیٹھوں گا دن ڈھلنے کے بعد
حسن شام وادی کشمیر ہو جاؤں گا میں

وہ اپنے محدود وسائل میں لاتعداد مسائل کو حل نہیں کر پاتا اور اس کے بچے چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے لئے ترس جاتے ہیں۔اس کا یہ کرب ذاتی نہیں بلکہ معاشرتی کرب بن کر

سامنے آتا ہے۔

مرے بچے ہوائے دشت محرومی کی زد پر ہیں
یہ پودے بھی جواں ہوں گے مگر آہستہ آہستہ

مٹی کا کھلونا بھی میسر نہیں آیا
میں اس کی خوشی لے کے کبھی گھر نہیں آیا

وہ سر بلند ہے میری گلی کے بچوں میں
کہ جس کے ہاتھ میں مٹی کا اک کھلونا ہے

اور جب اس کا بڑا بچہ ذرا سنبھل جاتا ہے تو وہ اس سے کیا کیا امیدیں وابستہ کر لیتا ہے۔ وہی امیدیں جو نچلے طبقے کا ہر باپ اپنے بچوں سے رکھتا ہے۔ حصول رزق کی تمنا، معاشی بوجھ کم کرنے کا سہارا اور اچھے دنوں کی آرزو۔

اب میری بیوی کی آنکھوں کی چمک بڑھنے لگی
میرا اک بچہ بھی مزدوری کے قابل ہو گیا

اور جب اس کے حالات کچھ سنور جاتے ہیں تو وہ ایک نیا شعر کہتا ہے جو اوپر لکھے گئے شعر کا تسلسل ہے لیکن وہ اس شعر کا مصرعہ اول وہی رہنے دیتا ہے۔ جہاں پر نظام تبدیل نہیں ہوتا، وہاں اگر مصرعہ تبدیل کر بھی دیا جاتا تو کونسا فرق پڑتا۔

میرا اک بچہ بھی مزدوری کے قابل ہو گیا
اس حوالے سے مرے حالات کچھ بہتر بھی ہیں

فہرست

☆	حمد	1
☆	نعت	3
☆	خطۂ فردوسِ بریں	5
☆	مرا وجود یہ اعزاز معتبر چاہیے	6
☆	وہ بھی اب آنسوؤں سے تر نظر آتا ہے	10
☆	جگر کا درد ہے درماں نہیں ہے	12
☆	پھر وہی سوچ کہ یہ واقعہ کب دیکھتے ہیں	14
☆	اب جتنا لہو ہے وہ چراغاں کے لئے رکھ	16
☆	سایہ ہے کہ انساں ہے اگر میرے ساتھ ہے	18
☆	وسعتِ دشت تمنا سے گزر جائیں گے ہم	20
☆	بدن کہیں بھی رہا ہو خیال گھر میں رہا	22
☆	کوئی نشان پسِ جستجو تو رہ جائے	24
☆	ہم اکثر سن تو لیتے ہیں مگر اچھی نہیں لگتی	26
☆	میں کہ مزدور ہوں (نظم)	28
☆	بستر پر کانٹوں کا بستر کر دیتے ہیں	30
☆	حصارِ سنگ میں رہنا اک آسرا سا تھا	32
☆	مالکِ ارض سما اب کسی صورت گزرے	34
☆	کچھ وقت میرے ساتھ گزارا چلا گیا	36

☆ دہلیز تک آیا ہوں مکاں سے نہیں نکلا — 38
☆ جدھر جدھر کو بگولے گئے گیا میں بھی — 40
☆ درماندگی شام و سحر کہہ نہیں سکتے — 42
☆ کسی صورت کسی عنوان نہ رکھنا — 44
☆ امید تو قوی تھی مگر کیوں نہیں ہوئی — 46
☆ فضا میں وہ کہاں تک جا سکا تھا کچھ نہ پوچھو — 48
☆ ارادے انتشارِ فکر سے دم توڑ دیتے ہیں — 50
☆ مایوس اگر ذوقِ نظر ہو تو (قطعہ) — 52
☆ ابھی ہویدا ہوا ہے ابھی ہوگا — 53
☆ ہنوز درد کا احساس سر میں رہتا ہے — 55
☆ سرِ مسافت جاں مستقر بہت سے تھے — 57
☆ وہ اپنے پورے بدن کی طرف پلٹ نہ سکے — 59
☆ مکتب صبر و رضا میں آئے — 61
☆ واللہ خیر الرازقین (نظم) — 63
☆ اردگرد آس پاس ہنگامے — 66
☆ انشاءاللہ (نظم) — 68
☆ بظاہر کچھ نہ ہونا طے ہوا ہے کچھ نہیں ہوگا — 70
☆ وجہ فساد جاں ہے ذرا ایسا کہ کیا کہیں — 72
☆ زہے قسمت کہ یادِ رفتگاں کے ساتھ رہتا ہوں — 74
☆ مری طلب مری خواہش ہے سرخرو رہنا — 76

☆	میری تمثیل بھی تھا اپنا تماشہ ہی نہ تھا	78
☆	تسکین بھی دیتا ہے جلاتا ہے لہو بھی	80
☆	ہیں تو اب بھی مگر بہت کم ہیں	82
☆	نوبیاہتا نوجوان سے گفتگو (نظم)	84
☆	سرحدِ جاں سے جو گزرے تو گزرنے دیجے	86
☆	یوں تذکرۂ صورتِ حالات نہ کرنا	88
☆	روح وارفتۂ تکمیلِ طلب ہے سرِ خواب	90
☆	سروں پر کسی بوسیدہ ردا تانے ہوئے ہیں	92
☆	تو ہی نہیں بدلا ہے بدل جائیں گے ہم بھی	94
☆	سحر اور شام یکساں دیکھتا ہوں	96
☆	غبارِ دشت پسِ کہسار اچھالتا	98
☆	پھر وہی وقت ہوا ایسا بھی تو ہو سکتا ہے	100
☆	دامنِ قرطاس پر ہر واقعہ لکھتے رہے	102
☆	قریۂ جاں میں اک آشوبِ سخن آج بھی ہے	104
☆	ہمارے گھر میں بھی دو چار دن گزارے کرے	106
☆	اس کی آنکھیں ہم نے دیکھیں نم	108
☆	کھنڈرات کو دیکھ کر (نظم)	110
☆	سلوکِ چارہ گراں ناروا عجیب سا ہے	112
☆	طے کئے اس نے صعوبت کے سفر اپنے لئے	114
☆	زمیں لرزنے لگی ہے اگر کہیں ٹھہرے	116

☆ بنتے ہیں خیالوں میں بھنور ایک ہی جیسے 118

☆ خود سنو میری داستاں مجھ سے 120

☆ یہ صورت تسکینِ دل و جاں بھی بہت ہے 122

☆ وہ پھر پلٹ کے مرے گھر بچشم تر جائیں 124

☆ مصلحت سے پاک لفظوں سے کبھی آواز دے 126

☆ بدل رہا ہوں میں مسلسل لہو کو پانی میں 128

☆ پھر یوں ہوا کہ نقشِ قدم تھے کوئی نہ تھا 130

☆ تکمیلِ تمنائے سفر کرتے رہے ہیں 132

☆ ہوا ہے کربِ رگِ جاں کی انتہا ہوتا 134

☆ یہ بھی نہیں کہ اس کا کہا معتبر نہ تھا 136

☆ امید (نظم) 138

☆ بلند اقبال (نظم) 139

☆ دامنِ فکر سے ذہنوں کو ہوا دی جائے 141

☆ خیالِ صحن و دریچہ و در نہیں رکھتے 143

☆ اس کے آتے ہی سحر کیوں ہو گئی 145

☆ دن کا ہنگام ہے یا رات نہیں کہہ سکتے 147

☆ جب میں اس کے قصر سے اٹھ کر اپنے گھر میں آیا ہوں 149

☆ قطعہ 151

☆ لرزاں ہدفِ تلخیٔ گفتار بہت ہیں 152

☆ ہدفِ چشم تماشہ ہوگا 154

☆ کچھ پریشان سے ہیں کوچہ و بازار میں بھی 155

☆ مضمحل بسترِ جاں ہے ذرا دیکھیں تو سہی 156

☆ بچے کا ہاتھ جا نہ سکا آسمان پر 158

☆ ہوائیں مضمحل ہوں گی اگر آہستہ آہستہ 160

☆ بکھر گیا جو اٹھا ہوں کبھی کسی کے خلاف 162

☆ اب کفِ افسوس ملتے ہیں کہ کیا کرتے رہے 164

☆ جیسا کچھ بھی روبرو ہے اس سے بہتر اور ہے 166

☆ مجبوریِ حالات نے ہر بات عیاں کی 168

☆ پھر کوئی شیریں سخن اور بھی تجھ کو ملے 170

☆ رقصِ خس و خاشاک سرِ آب نہ دیکھیں 172

☆ کیا حادثہ ہوا ہے کہاں میں یہاں کے لوگ 174

☆ ہوا کی تاب کہاں لا سکیں گے ایسے پر 176

☆ قلم بدست ہوں اور سوچتا ہوں کیا لکھوں 178

☆ دل ہوا ہے ہدفِ تیرِ جفا کتنی بار .179

☆ کسی گوشے میں دل کے سارے غم رکھو تو بہتر ہے 180

☆ وقت آرام سرِ دشتِ جنوں ملتا ہے 181

☆ مضمحل کر نہ سکی گردشِ ایام ہمیں 183

☆ دور سے دیکھا ہوا منظر بھی اک دھوکا نہ ہو 185

☆ غم میسر اگر نہیں ہوتا 187

☆ پھر کوئی چارہ گر شدتِ آزار بھی ہو 189

☆ اس کی شناخت اس کے خیالات سے بھی ہو 191
☆ مٹی کا کھلونا بھی میسر نہیں آیا 193
☆ صحرائے جاں میں موسمِ برسات آ گیا 195
☆ پدر کی سوچ میں حائل ہوا تھا بیچارہ 197
☆ لپٹ گئے تھے جو زنجیرِ دست و پا کی طرح 199
☆ کس طرح نزدیک تر ہوں فاصلے کیسے 201
☆ دن بھر سنگِ آوارہ کی مانند پھرے ہیں 203
☆ سنگ لوٹ آئیں گے محرومِ ثمر کس سے کہیں 205
☆ میں اپنے سامنے تعبیرِ خواب رکھتا ہوں 207
☆ وہ لوگ انتہا کے مروت شناس تھے 208
☆ نشانِ رفتگاں ابتر کھڑے ہیں 210
☆ قصر کی تعمیر کے منظر میں یہ منظر بھی ہیں 212
☆ خلقتِ شہرِ فسردہ میں نمایاں رہنا 214
☆ ہر انقلاب کے وقت کی زد سے بچی ہوئی 216
☆ کبھی گلشن کبھی صحرا کبھی دریا رکھا 218
☆ سکونِ دل جسے کہتے تھے دردِ سر بھی کہا 220

حمد

حمد و ثنائے خالقِ اکبر نہ ہو سکی
ہم سے یہ رہ گذارِ وفا سر نہ ہو سکی

تسکینِ حُسنِ ذوقِ عبادت نہیں ہوئی
اشکوں سے سجدہ گاہ اگر تر نہ ہو سکی

یوسف نہ تھے کہ چاہِ طلب میں اُتر سکیں
تقلیدِ جُستجوئے پیمبر نہ ہو سکی

اظہارِ انتہائے عقیدت نہ ہو سکا
ہم سے نیاز مندیٔ داور نہ ہو سکی

ہر شے کی انتہا بھی ہوئی ابتدا کے بعد
کوئی بھی تیری ذات کا مظہر نہ ہوسکی

ابتک مجھے حقوقِ سکونت نہیں ملے
اب تک تیری زمین مرا گھر نہ ہوسکی

ہم معترف ہیں کارگہِ ہست و بود میں
اشعرؔ ثنائے شافعِ محشر نہ ہوسکی

نعتؐ

آپؐ کا صدقہ ہے دُنیا زندگی ہے آپؐ سے
وسعتِ کون و مکاں میں روشنی ہے آپؐ سے

آپؐ نے رکھی ہے آب و گِل پہ بنیادِ حیات
ابتدائے عالمِ امکاں ہوئی ہے آپؐ سے

آپؐ ہی تقسیم کرتے ہیں فِراست کے نجوم
عقلِ انسانی ہدایت مانگتی ہے آپؐ سے

آپؐ نے روشن کئے ہیں آدمیت کے چراغ
ہر زمانے میں وقارِ آدمی ہے آپؐ سے

میرا حُسنِ بندگی ہے آپؐ کی سیرت کا فیض
میرے سجدوں میں خلوصِ بندگی ہے آپؐ سے

آپؐ سے لیتا ہے سورج بھی متاعِ روشنی
چاند کے بے حِس بدن میں دِلکشی ہے آپؐ سے

جب بھی سطحِ آب سے اُٹھتی ہے رحمت کی گھٹا
کون سے خطے پہ برسوں پوچھتی ہے آپؐ سے

اب تو اشعرؔ کو طلب کر لیجے شہرِ نور میں
اس غریبِ رہگذر کی لَو لگی ہے آپؐ سے

خطہء فردوسِ بریں

قریہء نو میں جب آباد ہوئے اہلِ ہنر
دشتِ پُر ہول میں جاری ہوا فردا کا سفر

قافلے سعیء مسلسل کے سفر کرنے لگے
اہلِ دل کاوشِ آغاز سحر کرنے لگے

رفتہ رفتہ رُخِ زیبائے تمنا نکھرا
روشنی پھیل گئی وقت کا چہرہ نکھرا

کاوشِ بندہ مزدور نے حل کی مشکل
عکسِ آئینہ ہوا حُسنِ رخِ مستقبل

دفعتاً وادیء پُر خار کی قسمت بدلی
وقت نے دامنِ کہسار کی قسمت بدلی

سنگریزوں میں ہویدا ہوئے آثارِ چمن
دشتِ ویراں کو مِلے خلعت و دستارِ چمن

اجنبیت نہ رہی ربط کا آغاز ہوا
سب کا اک رنگ ہوا ایک ہی انداز ہوا

یوں بتدریج نئے دور کا آغاز ہوا
طبقہء فِکر رسا محوِ تگ و تاز ہوا

ایسے کچھ لوگ بھی اس قریہ نو میں آئے
جنکی آمد سے بڑھے علم و ادب کے سائے

نخلِ تہذیب و ثقافت تروتازہ بھی ہوا
کام یہ اسلحہ سازی کے علاوہ بھی ہوا

اہلِ دانش نے نئے دور کا آغاز کیا
اپنے افکار کو وابستہء آواز کیا

لائقِ عزت و تکریم ہیں وہ اہلِ کرم
جنکی کاوش سے ہوئی پرورشِ لوح و قلم

روشنی پرورشِ لوح و قلم کرنے لگی
زندگی اپنے خدوخال رقم کرنے لگی

وقت کی لوح پہ مضمونِ حسیں لکھا گیا
واہ کو خطہء فردوسِ بریں لکھا گیا

مرا وجود یہ اعزازِ معتبر چاہے
کہ گردِ راہِ مشقت لباس پر چاہے

بہت سے لوگ ہوں ترتیبِ رسمِ غم کے لیے
فغاں پسندیِ جاں حلقہء اثر چاہے

سفر کا لطف ہی جب ہے کہ رہ نوردِ وفا
قدم قدم کے لئے سنگِ رہگذر چاہے

وہ ایسے لوگ کہ دیکھیں بھی دشمنوں کی طرح
میں ایسا شخص کہ ان کو بھی ٹوٹ کر چاہے

وہ ان کی سوچ کہ میرے چراغ بھی نہ جلیں
یہ میرا ظرف کہ سب کے لئے سحر چاہے

کچھ ایسا خاص تعلق نہیں کسی سے مجھے
مگر یہ بات بھی ممکن ہے وہ اگر چاہے

کسے عزیز نہیں خیر و آشتی اشعر
وہ کون ہے جو تماشائے سنگ و سر چاہے

وہ بھی اب آنسوؤں سے تر نظر آتا ہے مجھے
ایک چہرہ ہے کہ اکثر نظر آتا ہے مجھے

بند کر لیتا ہوں آنکھیں تو سرِ لوحِ خیال
رشکِ مہتاب پسِ در نظر آتا ہے مجھے

اب تو وہ کوچہ و بازار بھی کچھ یاد نہیں
خواب میں اُسکا مگر گھر نظر آتا ہے مجھے

میں تو آیا تھا سکوں بخش امیدیں لے کر
اب یہاں عرصہء محشر نظر آتا ہے مجھے

میں نے دیکھی نہ کبھی فصلِ بہاراں سرِ خواب
دشتِ پر ہول کا منظر نظر آتا ہے مجھے

خوف طاری ہے کفِ دست کی تحریروں سے
ہاتھ کھولوں تو مقدر نظر آتا ہے مجھے

کربلا آج بھی اشعر تری تحویل میں ہے
ہر طرف شام کا لشکر نظر آتا ہے مجھے

جگر کا درد ہے درماں نہیں ہے
غزل کہنا کوئی آساں نہیں ہے

کئی امکان وابستہ تھے دل سے
مگر اب تو کوئی امکاں نہیں ہے

مسلسل بارشیں تھم سی گئی ہیں
کوئی قطرہ سرِ مژگاں نہیں ہے

غنیمت ہے غمِ جاناں نہ رہنا
کہ اب طولِ شبِ ھجراں نہیں ہے

مگر مشکل ہے اس کی زد سے بچنا
غمِ دوراں غمِ جاناں نہیں ہے

وہ یہ کہہ کر گیا ہے میرے گھر سے
یہاں تو کوئی بھی ساماں نہیں ہے

کتابِ زیست میں قصے بہت ہیں
مگر اشعؔر کوئی عنواں نہیں ہے

پھر وہی سوچ کہ یہ واقعہ کب دیکھتے ہیں
کون توڑے گا فسوں کاریِ شب دیکھتے ہیں

منتظر ہیں کہ کبھی بادِ سکوں خیز چلے
مضمحل ہیں کہ ہواؤں کے غضب دیکھتے ہیں

ایک ہی جیسے سرابوں کا تسلسل ہے کہ لوگ
ایک عرصہ سے سرِ دشتِ طلب دیکھتے ہیں

مژدہء خوبیء تعبیر ملے گا کہ نہیں
دیکھیے خواب میں دیکھا ہوا کب دیکھتے ہیں

ہم میں ایک شخص بھی ناواقفِ حالات نہیں
سب کے سب صاحبِ ادراک ہیں سب دیکھتے ہیں

یہ بھی ایک طرزِ تکلم ہے سرِ بزم کہ ہم
سب کے چہرے کی طرف مُہر بلب دیکھتے ہیں

اپنے ہاتھوں کی پراسرار لکیریں اشعرؔ
ہم نے پہلے کبھی دیکھی ہیں نہ اب دیکھتے ہیں

اب جتنا لہو ہے وہ چراغاں کے لیے رکھ
اے دِل یہ خزینہ شبِ ہجراں کے لیے رکھ

مانوس نہ ہو تیرگیء حجلہء جاں سے
اک حُسنِ طلب خوبیء امکاں کے لیے رکھ

اس کوزۂ جاں کو سرِ مژگاں نہ تہی کر
کچھ خون کے قطرے کسی طوفاں کے لیے رکھ

زخموں کی کسک خوئے وفا بن کے نہ رہ جاے
آمادہ اسے لذتِ درماں کے لیے رکھ

تاراج نہ کر آرزوے کوئے بتاں کو
اک گوشہ مگر دشت و بیاباں کے لیے رکھ

بیتاب ہے ہر قطرہء خوں جسکی طلب میں
نذرانہء جاں اس شہِ خوباں کے لیے رکھ

اشعؔر جو فشارِ غمِ فردا سے بچالے
ایسا کوئی نشتر بھی رگِ جاں کے لیے رکھ

سایہ ہے کہ انساں ہے اگر میرے ساتھ ہے
کیوں مجھ سے گریزاں ہے اگر میرے ساتھ ہے

میں تجھ سے پشیماں ہوں کہ کچھ بھی نہیں رکھتا
تو بھی تہی داماں ہے اگر میرے ساتھ ہے

مجھ کو ہے تری چشمِ عنایت کی ضرورت
دل سائلِ درماں ہے اگر میرے ساتھ ہے

یہ بات خلافِ ادبِ ہمسفری ہے
کیوں دست و گریباں ہے اگر میرے ساتھ ہے

تو خار سمجھ مجھ کو مگر میرے لئے تو
سرتاپا گلستاں ہے اگر میرے ساتھ ہے

میں تیرگیِ شب سے پریشاں بھی نہیں ہوں
تو شمعِ فروزاں ہے اگر میرے ساتھ ہے

اشعر کے لیے تیرا تبسم بھی بہت ہے
بس اِک یہی ارماں ہے اگر میرے ساتھ ہے

وسعتِ دشتِ تمنا سے گزر جائیں گے ہم
یا سرِ رہگذرِ ہجر ہی مر جائیں گے ہم

یہ نہ ہو ذوقِ مسافت میں کمی آجائے
نیند آئے گی اگر زیرِ شجر جائیں گے ہم

سوچتے رہتے ہیں اکثر کہ کسی دن شاید
اسکی دہلیز پہ با دیدہء تر جائیں گے ہم

شہرِ بے مہر میں اب اور کہاں تک ٹھہریں
دل ہے بیتاب کہ کب لوٹ کے گھرجائیں گے ہم

ایسے جائیں گے کہ پہچان نہ پائے وہ بھی
اُس کے کوچے میں کسی روز اگر جائیں گے ہم

اب یہ خواہش ہے کہ گہرائی کے منظر دیکھیں
ریگِ ساحل سے سمندر میں اُتر جائیں گے ہم

اِک صدا غیب سے آتی ہے مسلسل اشعر
جس طرف سے کبھی آئے تھے اُدھر جائیں گے ہم

بدن کہیں بھی رہا ہو خیال گھر میں رہا
سفر میں رہ کے بھی دل خلدِ بام و در میں رہا

میں کس کے حسنِ تکلم کی باز گشت میں ہوں
وہ کون ہے جو میرے ساتھ رہگزر میں رہا

کچھ ایسی صاف رہی ہے فضائے قریہء جاں
چبھن رہی مرے دل میں نہ درد سر میں رہا

بہت سکون سے طے کی ہے تیرگی میں نے
کہ عکسِ صورت زیبا مری نظر میں رہا

بہار آئی ثمر بار فصلِ جاں بھی ہوئی
خزاں کا خوف مسلسل مگر شجر میں رہا

دیارِ حُسن میں کچھ دن تو خیر سے گذرے
پھر ایک معرکہ سخت سنگ و سر میں رہا

کشید کرتا رہا مجھ سے میری دانائی
وہ جتنے دن بھی میرے حلقہء اثر میں رہا

گرانیء شب ھجراں کے بعد بھی اشعر
مرا وجود گرانباریٔ سحر میں رہا

کوئی نشان پسِ جستجو تو رہ جائے
نقوشِ پائے طلب میں لہو تو رہ جائے

ہم اپنا خونِ کفِ پا بھی سُو بہ سُو کر دیں
کہ رہگذارِ وفا سرخرو تو رہ جائے

چراغِ حُسنِ توقع مسافتِ شب میں
رفیقِ دشتِ بلا ایک تُو تو رہ جائے

خزاں کا جبرِ مسلسل حریفِ جاں ہی سہی
زُباں پہ تذکرہء رنگ و بو تو رہ جائے

دعا کرو کہ ہوا میں کثافتیں نہ رہیں
زمیں کے ظرف میں تابِ نمو تو رہ جائے

ھنوز فکر میں غلطاں ہیں بے بضاعت لوگ
کہ کچھ رہے نہ رہے آبرو تو رہ جائے

یہ کیا کہ وہ بھی گریزاں ہے ان دنوں اشعرؔ
سرشتِ غم کے لیئے اک عدو تو رہ جائے

ہم اکثر سُن تو لیتے ہیں مگر اچھی نہیں لگتی
وہی اک گفتگو بارِ دگر اچھی نہیں لگتی

دریدہ پیراہن پھرنے سے بہتر ہے کہ سو جائیں
ہم ایسے لوگ ہیں جنکو سحر اچھی نہیں لگتی

ذرا سی دیر اس کا رو برو رہنا، چلے جانا
یہ طرزِ التفاتِ مختصر اچھی نہیں لگتی

ہزاروں مہ رخوں کی روشنی معدوم ہو جانا
یہ کیفیت بساطِ خاک پر اچھی نہیں لگتی

قیاساً لکھتے رہنے سے مسائل حل نہیں ہوتے
ہمیں اخبار میں کوئی خبر اچھی نہیں لگتی

پسندیدہ نہیں ہوتا خیالوں میں مُخل ہونا
کوئی دستک ہمیں بیرونِ در اچھی نہیں لگتی

مناسب ہے کہ اشعر شاعری میں اپنا لہجہ ہو
کسی بھی شخص کے زیرِ اثر اچھی نہیں لگتی

میں کہ مزدور ہوں

میں جب افسردہ ہوتا ہوں

میرا دل صورتِ حالات سے بیزار ہوتا ہے

گرفتِ کرب سے میری رگیں مفلوج ہوتی ہیں

مری آنکھوں میں دہشت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا

مرے سینے میں احساسِ اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا

مسلسل اک عذابِ آگہی

اندیشہ ہائے روز و شب

زندہ رہنے کی دعاؤں سے مفر

اکثر مری تخریب کا امکاں مہیا کرتے رہتے ہیں

ہتھیلی اپنے زانوں پر رکھے

لکیروں کے مقدر آئینے میں

میں عکس خوبیء فردا کو اپنے روبرو محسوس کرتا ہوں

مگر اگلے ہی دن گذرے ہوئے دن سے سوا

آشوبِ جسم و جاں کا اک گرداب مجھ میں رقص کرتا ہے

کبھی یہ وحشیانہ رقص دل کی دھڑکنوں کو تیز کرتا ہے

کبھی خونِ رگِ جاں نوکِ مژگاں پر جلاتا ہے۔

میں گھبرا کر جب آنکھیں بند کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے

کہ اک وحشی قبیلے میں گھرا

مجبور و آزردہ رسن بستہ کھڑا ہوں

اور اس وحشی قبیلے کے سبھی افراد مجھ پر طنز کے نشتر چلاتے ہیں

کہ میرا استخوانی جسم ان کی اجتماعی بھوک کو کیسے مٹائے گا

مگر پھر بھی

وہ میرے گرد محوِ رقصِ وحشت ہیں

کہ میرے استخواں اور خون کے قطرے زبوں مایہ سہی، پھر بھی غنیمت

ہیں

کہ اس وحشی قبیلے کے تمام افراد کے چہرے بھوک کی واضح علامت ہیں

یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی

میں نیزوں کی چبھن محسوس کر کے

بند آنکھیں کھول دیتا ہوں

میرے چوگرد پھر وحشی نہیں ہوتے

مرے اپنے ہی ہوتے ہیں

بستر پہ کانٹوں کا بستر کر دیتے ہیں
اندیشے دیواروں میں در کر دیتے ہیں

دل کو غم سہنے کا خوگر کر دیتے ہیں
خوابِ گراں شیشے کو پتھر کر دیتے ہیں

دیوانے ہی وحشت سے منسوب نہیں ہیں
ایسی باتیں ہم بھی اکثر کر دیتے ہیں

غزلوں میں اظہارِ حقیقت ہوتا ہے
لوگوں کو حالات سخنور کر دیتے ہیں

ایسے لوگوں میں ہے بود وباش مری
جو لفظوں کو ناوک و نشتر کر دیتے ہیں

جب میں اُن کا اسمِ گرامیؐ لیتا ہوں
وہ میرے حالات کو بہتر کر دیتے ہیں

جو باتیں سینوں میں چبھتی رہتی ہیں
ہم اشعر شعروں میں اجاگر کر دیتے ہیں

حصارِ سنگ میں رہنا اک آسرا سا تھا
ہوائیں تیز تھیں تنکا مگر ذرا سا تھا

وہ پہلے دن ہی سفر میں تھکا تھکا سا تھا
کہ اس کا ذوقِ مسافت نیا نیا سا تھا

چلا تو سنگِ سرِ رہگذر مزاج تھا وہ
شجر کے سائے میں بیٹھا تو نقشِ پا سا تھا

مجھے رفاقت بادِ صبا کی خواہش تھی
سلوک اُس کا مگر دشت کی ہوا سا تھا

مرے لبوں کی نمی تھی کہ سعیِ لا حاصل
وہ ریگذار سا چہرہ بہت ہی پیاسا تھا

وہ دن بھی تھے کہ اسی شہرِ دلبراں میں ہمیں
جو اجنبی نظر آیا وہ آشنا سا تھا

وہ خود خموش ہے جس کے خیال میں اشعر
مرا وجود بھڑکتا ہوا دیا سا تھا

مالکِ ارض و سماء اب کسی صورت گذرے
یہ سحر جس پہ گُمانِ شبِ فرقت گذرے

پھر سے روپوش ہو اے مہرِ جہانتاب کہ ہم
تیری کرنوں سے بہ احساسِ ندامت گذرے

لوگ اگر پُرسشِ احوالِ پریشاں نہ کریں
کچھ نہ کچھ عمرِ گرانبار غنیمت گذرے

اب وہ منزل کی دہکتی ہوئی آغوش میں ہیں
دشتِ پُر ہول سے جو لوگ سلامت گذرے

باغ لوگوں کے اجڑ جائیں تو احساس نہ ہو
اپنا اک پھول بھی بکھرے تو قیامت گذرے

نفرتیں موردِ الزام ہوئی ہیں ، لیکن
حادثے سارے محبت کی بدولت گذرے

میری حالت بھی اسی جیسی رہی ہے اشعرؔ
جس بگولے پہ گمانِ قدو قامت گذرے

کچھ وقت میرے ساتھ گزارا چلا گیا
آثارِ صبح ہوئے کہ ستارہ چلا گیا

تضحیکِ رسم و راہِ ملاقات یوں بھی کی
کچھ فاصلے سے اُس نے پکارا چلا گیا

تا دیر اُس نے مجھ سے کبھی گفتگو نہ کی
نشتر سا ایک دل میں اُتارا چلا گیا

ہر شب یہی ہوا کہ سرِ کوئے دلبراں
میرے تصوّرات کا دھارا چلا گیا

ہم خود بھی اُسکی ذات سے کچھ مطمئن نہ تھے
وہ خود بھی ہو سکا نہ ہمارا چلا گیا

حائل رہیں نشاطِ تصور میں دستکیں
دیوار نے جو نقش ابھارا چلا گیا

اشعرؔ تضادِ فکر کہ جب وہ جدا ہوا
محسوس یہ ہوا کہ سہارا چلا گیا

دہلیز تک آیا ہوں مکاں سے نہیں نکلا
ابتک میں حصارِ غمِ جاں سے نہیں نکلا

عرصہ ہوا ہجرت تو مرے جسم نے کی تھی
احساس مگر کوئے بتاں سے نہیں نکلا

اک کرب ہے جو میری رگِ جاں میں رواں ہے
اک سوزِ نہاں ہے کہ بیاں سے نہیں نکلا

ممکن ہے کبھی موسمِ گل بھی نظر آئے
اک عمر ہوئی دورِ خزاں سے نہیں نکلا

اُس شخص کا چہرہ بھی مرا عکسِ زبوں تھا
پھر حرفِ طلب میری زباں سے نہیں نکلا

جو میرے لیے مژدہء پیغامِ اجل ہو
ناوک وہ ابھی ظرفِ کماں سے نہیں نکلا

پہنچوں گا کسی روز تو میں بابِ یقیں تک
اشعرؔ میں ابھی دشتِ گماں سے نہیں نکلا

جدھر جدھر کو بگولے گئے گیا میں بھی
شریکِ رہگذرِ ابتلا ہوا میں بھی

متاعِ راہ نوردی ہے گردِ محرومی
پھرا ہوں دشتِ تمنا میں جابجا میں بھی

وہ ایک روز ملا تھا مگر گریزاں سا
پھر اس کے بعد کسی سے نہیں ملا میں بھی

گراں تو گذرے بہت اُس کے تبصرے لیکن
خود اپنے آپ سے واقف تو ہو سکا میں بھی

یقین ہے کہ مجھے وہ بھی سوچتا ہو گا
اُسی کی یاد کی تحویل میں رہا میں بھی

مرے لہو نے بھی ماحول کو ضیا بخشی
چراغِ شب کی طرح عمر بھر جلا میں بھی

مجھے بھی اسکی عطا پر یقین ہے اشعرؔ
ہجومِ تشنہ لباں سے نہیں اُٹھا میں بھی

درماندگئ شام و سحر کہہ نہیں سکتے
کہنے کو بہت کچھ ہے مگر کہہ نہیں سکتے

ہم ایسے بھی ناواقفِ حالات نہیں ہیں
لکھ لیتے ہیں کاغذ پہ اگر کہہ نہیں سکتے

مشکل ہے بہت وسعتِ صحرا کو سمجھنا
اب اور کہاں تک ہے سفر کہہ نہیں سکتے

کچھ نقش اُبھرتے ہیں سرِ لوحِ تصور
محسوس کیا کرتے ہیں ڈر کہہ نہیں سکتے

صورت گریِ صبحِ فروزاں نہیں ہوتی
مفلوج ہے کیوں دستِ ہنر کہہ نہیں سکتے

وہ شکوۂ اندازِ تغافل تھا کسی سے
جس بات کو ہم بارِ دِگر کہہ نہیں سکتے

اب روح جہاں تابہ سحر رہتی ہے اشعر
کیوں چھوڑ کے آئے تھے وہ گھر کہہ نہیں سکتے

کسی صورت کسی عنواں نہ رکھنا
کبھی خود کو حریفِ جاں نہ رکھنا

محبت کی مبارک ساعتوں کو
پسِ اندیشۂ ہجراں نہ رکھنا

تم اپنی سمت سے ترکِ وفا کا
برائے نام بھی امکاں نہ رکھنا

یہی معراجِ حُسنِ زندگی ہے
کہ دل میں خواہشِ درماں نہ رکھنا

شبِ غم کی سحر ہونے سے پہلے
کوئی قطرہ سرِ مژگاں نہ رکھنا

ہوا کے زور میں ممکن ہی کب ہے
چراغوں کو تہہِ داماں نہ رکھنا

لہو کے اور بھی مصرف ہیں اشعرؔ
اسے وقفِ غمِ جاناں نہ رکھنا

امید تو قوی تھی مگر کیوں نہیں ہوئی
پھر زیرِ غور ہے کہ سحر کیوں نہیں ہوئی

ھنگامِ شب سے ربطِ مسلسل کے باوجود
مانوس تیرگی سے نظر کیوں نہیں ہوئی

کچھ خونِ صرفِ سعیِ چراغاں کیا تو تھا
کوشش مگر یہ بارِ دگر کیوں نہیں ہوئی

وہ آگہی کہ سرگریباں ہے میرے ساتھ
زنجیرِ پائے قصدِ سفر کیوں نہیں ہوئی

ہم جس زمیں پہ آئے تھے صدقے اُتار کے
ابتک ہمارے واسطے گھر کیوں نہیں ہوئی

یہ کفر ہے کہ لُٹ کے سرِ رہگذر کہیں
اس حادثے کی اس کو خبر کیوں نہیں ہوئی

اشعرؔ وہ شخصیت تو میری ہم خیال تھی
پھر بھی رفیقِ راہ گذر کیوں نہیں ہوئی

فضا میں وہ کہاں تک جا سکا تھا کچھ نہ پوچھو
مگر پھر دفعتاً کیسے گرا تھا کچھ نہ پوچھو

جسے محسوس کرنا اس کے چہرے سے عیاں تھا
وہ اس کی ذات کا کیسا خلا تھا کچھ نہ پوچھو

مری اپنی رگیں مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں
جو میرے کان میں اس نے کہا تھا کچھ نہ پوچھو

پھر اس نے مجھ سے چلا کر کہا تھا اب نہ آنا
وہ کیسی کشمکش میں مبتلا تھا کچھ نہ پوچھو

عیادت کے لئے جو لوگ اُس کے روبرو تھے
جواباً سب سے وہ کہتا رہا تھا کچھ نہ پوچھو

ہر ایک راہ گیر اس کو دیکھ کر حیرت زدہ تھا
وہ مرتے وقت کتنا خوش ہوا تھا کچھ نہ پوچھو

وہ کیفیت کہ اشعرؔ آخری ہچکی سے پہلے
تڑپ کر جب وہ سجدے میں جھکا تھا کچھ نہ پوچھو

ارادے انتشارِ فکر سے دم توڑ دیتے ہیں
گھروندے بن تو جاتے ہیں مگر ہم توڑ دیتے ہیں

کبھی اندیشہ ہائے روز و شب مائل بھی کرتے ہیں
مگر کچھ سوچ کر ہم کوزۂ سم توڑ دیتے ہیں

ہجومِ اہلِ گریہ میں پسندیدہ نہیں ہوتے
کچھ ایسے لوگ جو ترتیبِ ماتم توڑ دیتے ہیں

ہمیں شکوہ نہیں غمخواریِ اہلِ تعلق سے
مگر وہ انہماکِ لذتِ غم توڑ دیتے ہیں

محبت کے لیے دل کب کشادہ در نہیں ہوتا
مگر احباب عہدِ ربطِ پیہم توڑ دیتے ہیں

ہمیں پودوں میں اپنی شخصیت اچھی نہیں لگتی
نکل سکتے نہیں جس شاخ کے خم توڑ دیتے ہیں

جسے ہم اصطلاحاً شیشۂ پندار کہتے ہیں
کبھی اشعر اُسے بھی دام و درہم توڑ دیتے ہیں

قطعہ

پروردۂ شب نورِ سحر ہو تو غضب ہے
مایوس اگر ذوقِ نظر ہو تو غضب ہے

کوئی بھی غضب سر پہ مسلط نہیں رہتا
انصاف کا فقدان اگر ہو تو غضب ہے

ابھی ہویدا ہوا ہے، ابھی ہوا ہوگا
جو سطح آب پہ ابھرا ہے نقش کیا ہوگا

اُسے تلاش کرو صبح جسکی قید میں ہے
ابھی وہ حجلہء شب سے نہیں گیا ہوگا

بتِ شکستہ جو کھنڈرات سے مِلا ہے مجھے
کبھی اس اجڑے ہوئے شہر کا خدا ہوگا

بہت امیر ہیں بنجر زمین کے مالک
یہاں ضرور کوئی قافلہ لُٹا ہوگا

اسے بھی تشنہ ء تعبیر خواب کہہ لیجے
یہ آرزو کہ کبھی اس سے رابطہ ہوگا

براہ راست نہیں ہے جو گفتگو نہ سہی
وہ میرا حال کسی سے تو پوچھتا ہوگا

طلوعِ صبحِ مسرت بھی پیشِ رفت میں ہے
ہمیں یقیں ہے کہ اک دن یہ معجزہ ہوگا

اب اس پہ طنز کے پتھر نہ ماریئے اشعرؔ
یہ خشک پیڑ کبھی تو ہرا بھرا ہو گا

ہنوز درد کا احساس سر میں رہتا ہے
کہ عکسِ صورتِ فردا نظر میں رہتا ہے

پنپ رہی ہیں مسلسل عداوتیں اُس میں
وہ اک ہجوم جو چھوٹے سے گھر میں رہتا ہے

یہی ہوا ہے کہ اکثر شبِ فراق کے بعد
شبِ فراق کا پرتَو سحر میں رہتا ہے

میں خود تو پابہ سلاسل ہوں ان دنوں لیکن
مرا خیال ہمیشہ سفر میں رہتا ہے

میں پھول دیکھ کے فصلِ خزاں بھی سوچتا ہوں
مآلِ موسمِ گُل بھی نظر میں رہتا ہے

بدل رہی ہے بتدریج شخصیت اُس کی
وہ کس کے حلقۂ دامِ اثر میں رہتا ہے

زمیں پہ رہ کے بھی جنت نصیب ہے اشعؔر
جو اپنے حلقۂ دیوار و در میں رہتا ہے

سرِ مسافتِ جاں مستقر بہت سے تھے
جہاں جہاں میں رہا ہوں وہ گھر بہت سے تھے

بکھر گئے ہیں وہ سب اختلافِ رائے سے
مرے رفیق مرے ہمسفر بہت سے تھے

بہت سے لوگ تو پچھلے قدم ہی لوٹ آئے
کہ خار زار سرِ رہگذر بہت سے تھے

یہ انکشاف ہوا ہے طویل عمر کے بعد
ہماری سوچ کے پروردہ ڈر بہت سے تھے

شبِ سیاہ مسافر کی گشت میں گذری
سحر ہوئی تو کھلا بام و در بہت سے تھے

محال تھا کسی رہبر کو منتخب کرنا
حریص طرۂ دستار، سر بہت سے تھے

اُنھیں کو دیکھ کے ہم بھی سراب تک پہنچے
نقوشِ پاکہ سرِ رہگذر بہت سے تھے

بڑے سکون سے وہ شخص مر گیا اشعؔر
کہ اک مریض تھا اور چارہ گر بہت سے تھے

وہ اپنے پورے بدن کی طرف پلٹ نہ سکے
ہوا نے ایسے بکھیرا کہ پھر سمٹ نہ سکے

کچھ اس طرح وہ فسادِ ہوا سے لرزاں تھے
قریب آ بھی گئے تھے مگر لپٹ نہ سکے

یہ بار بار ہوا ہے سرِمسافتِ جاں
کچھ ایسے سنگِ گراں تھے جو ہم سے ہٹ نہ سکے

میں ایسا شخص کہ محوِ تلاشِ حُسنِ یقیں
غبارِ دشتِ قیاسات ہے کہ چھٹ نہ سکے

شبیہہِ لوحِ تصوّر یہ کیسے ممکن ہے
کہ ساری عمر تری جستجو میں کٹ نہ سکے

کچھ ایسے لوگ بھی تھے رہگذارِ ہستی میں
کہ سر جھکا کے چلے پھر بھی قد میں گھٹ نہ سکے

سکوتِ عرصۂ شب سود مند ہے اشعرؔ
کہ فکر شعر و سخن ہو تو دھیان بٹ نہ سکے

مکتبِ صبر و رضا میں آئے
ہم اگر بزمِ عزا میں آئے

ماں کی آغوش میں آئے تھے کہ ہم
کاسۂ دستِ گدا میں آئے

جو اثر شاخِ ثمر بار میں ہے
وہ کبھی دستِ دعا میں آئے

جس میں اندیشے ہی اندیشے ہوں
کون اس گھر کی فضا میں آئے

حبس ٹوٹا ہے تو بارش کی طرح
سنگریزے بھی ہوا میں آئے

خون کی بُو بھی سرِ صحنِ چمن
موجۂ بادِ صبا میں آئے

چھوڑ کر گوشۂ راحت اشعؔر
وسعتِ دشتِ بلا میں آئے

واللہ خیر الرازقین

اس موڑ سے اُس گھیر تک محوِ تلاشِ و جستجو
کوڑے کے اک اک ڈھیر تک رستہ بہ رستہ کو بکو
چھوٹی سی اک لکڑی لئے
سرکو ذرا سا خم کئے
تھیلا اٹھائے دوش پر
ہر سمت دوڑاتی نظر
کچھ زیرِ لب کہتی ہوئی
موسم کے دکھ سہتی ہوئی
سیمیں بدن غنچہ دہن
لیکن دریدہ پیراہن
انگشت دانتوں میں لئے
چادر سے سر ڈھانپے ہوئے
سن؟ کوئی نو دس سال کا جتنا مرا عابد رضا
اس دن غضب کی دھوپ تھی

وہ چلتے چلتے تھک گئی، رستہ بہ رستہ کو بکو

محوِ تلاشِ و جستجو

پہنچی وہ پھر زیرِ شجر

تھیلا رکھا اک شاخ پر

نیچے سے کچھ کنکر لئے

رکھ کر ہتھیلی پر گنے

کچھ دیر تک بیٹھی ہوئی اٹکھیلیاں کرتی رہی

پھر دفعتاً پرواز پر مائل ہوئی اس کی نظر

جب ایک دروازہ کھلا

اک ہاتھ جس میں اک بڑا سا ٹین تھا ظاہر ہوا

اس ہاتھ نے کوڑا گرایا ڈھیر سا اک ڈھیر پر

وہ اٹھی کنکر پھینک کر

اوپر چڑھا کے اپنے کف

دوڑی گئی وہ اُس طرف

کچھ ٹوٹے ڈبے ٹین کے

تھیلے میں رکھے بین کے

گتے کے کچھ ٹکڑے بھی تھے

چاروں طرف بکھرے ہوئے

جھک جھک کے فرشِ خاک پر

چنتی رہی لعل و گہر

جب دیکھا تھیلا بھر گیا

بچی نے گھر کا رُخ کیا

وہ مطمئن ہو کر چلی

اک ملحقہ دیوار پر لکھا تھا بحرفِ جلی

واللہُ خیر الرازقین واللہُ خیر الرازقین

اردگرد آس پاس ھنگامے
بے سبب' بے اساس ھنگامے

راستے ریگذار مستقبل
قافلے بے حواس ھنگامے

سنگ نا آشنائے عظمتِ سر
مرتبہ نا شناس ھنگامے

بڑھ گئی رات کی توانائی
ہو گئے بے لباس ھنگامے

وہ کبھی مطمئن نہیں رہتا
آ گئے جسکو راس ھنگامے

چھا گئی پھر مہیب خاموشی
رہ گئے محوِ یاس ھنگامے

میرے چہرے پہ ثبت ہیں اشعر
میرے گھر کے اداس ھنگامے

انشاء اللہ

درِ زنداں پہ بھی دستک دے گا
وقت ہم خاک نشینوں کا بھی ساتھی ہوگا
موم ہو جائیں گے زنجیر گراں کے حلقے
طوقِ آہن بھی پگھل جائے گا
آج تم خوش ہو کہ ہر لمحہء وقت
تم سے کہتا ہے کہ کیسے گذروں
لوٹ لوں غربت و افلاس کے ماروں کا سکوں
برق و باراں سے خرابوں کو زبوں حال کروں
اور پھر تم بھی وہی حکم دیا کرتے ہو
جو کبھی مصر میں فرعون دیا کرتا تھا
کوئی مشعل نہ جلے
کوئی موسیٰ نہ رہے
تیرگی جنکا مقدر ہے بدستور رہے
اور خرابوں میں دمکتے ہوئے کندن چہرے

شمعِ فانوسِ ہوس بنتے رہیں
اور بچوں کا جوانوں کا ضعیفوں کا لہو
سرخیِ شوکتِ شاہانہ رہے
لیکن اے بے خبر و فتنہ گر و بوالہوس
وقت کے نیل کی بپھری ہوئی موجوں سے بچو
جسکی چھاتی پہ سفینوں کو لیے پھرتے ہو
وقت کا نیل جو بپھرے گا تو اک طرفہ تماشہ ہوگا
تم! کہ فرعون ہو غرقِ تہہ دریا ہو گے
خندہ زن دوسری جانب کوئی موسیٰؑ ہوگا
وقت ہم خاک نشینوں کا بھی ساتھی ہوگا

بظاہر کچھ نہ ہونا طے ہوا ہے، کچھ نہیں ہوگا
پسِ پردہ یہی کچھ ہو رہا ہے، کچھ نہیں ہوگا

سرِ دشتِ طلب خوش فہمیاں ہیں رہ نوردوں کو
مگر مجھ سے میرے دِل نے کہا ' کچھ نہیں ہوگا

لہو کا صرف بے جا ہے سرِ مژگاں جلے رہنا
چراغوں سے کبھی کچھ ہوسکا ہے، کچھ نہیں ہوگا

مسائل اب ہمیں تحریکِ بیتابی نہیں دیتے
کہ ہم سے چارہ گر بھی کہہ چکا ہے، کچھ نہیں ہوگا

امیدِ صبحِ فردا اس کے لہجے سے نمایاں تھی
مگر میں نے جواباً کہہ دیا ہے ' کچھ نہیں ہوگا

وہ دل برداشتہ تھا میرے ناامید ہونے پر
سُو مجھ سے طنزیہ کہہ کر گیا ہے، کچھ نہیں ہوگا

صداؤں سے شبِ تنہائی میں خائف نہ ہو اشعرؔ
ہوا کی دستکیں ہیں اور کیا ہے، کچھ نہیں ہوگا

وجہِ فسادِ جاں ہے ڈر ایسا کہ کیا کہیں
اک ہمسفر تو ہے مگر ایسا کہ کیا کہیں

رستہ شناس ہم بھی نہیں اتفاق سے
وہ شخص بھی ہے بے خبر ایسا کہ کیا کہیں

ترتیب پا رہی ہے خرابی خیال میں
آشوبِ جاں ہوا سفر ایسا کہ کیا کہیں

کیسے گذر گئی شبِ ہجراں سی زندگی
یہ معرکہ ہوا ہے سر ایسا کہ کیا کہیں

کچھ لوگ اسکے سائے میں بیٹھے پھر اسکے بعد
بے برگ و بار ہے شجر ایسا کہ کیا کہیں

اک شمع کیا جلی کے سحر کا گماں ہوا
تاریک ہو گیا تھا گھر ایسا کہ کیا کہیں

اشعر نظر تو اس سے گریزاں ہے ان دنوں
دل ہے مگر کشادہ در ایسا کہ کیا کہیں

زہے قسمت کہ یادِ رفتگاں کے ساتھ رہتا ہوں
میں جزوِ کارواں ہوں کارواں کے ساتھ رہتا ہوں

حقیقت بینیء حالات سے وابستگی کم ہے
مُرصع کاریء حُسنِ گماں کے ساتھ رہتا ہوں

تصوّر کی کرشمہ سازیوں کو ربط ہے مجھ سے
میں اکثر اک ہجومِ دلبراں کے ساتھ رہتا ہوں

مرے اندر تصادم کے کبھی امکاں نہیں ہوتے
میں اپنی ذات میں امن و اماں کے ساتھ رہتا ہوں

مسلسل جبر سہہ لینا مری عادت میں شامل ہے
بہت عرصے سے اک سنگِ گراں کے ساتھ رہتا ہوں

مرا اپنا کوئی مسکن نہیں صحنِ گلستاں میں
کبھی اِس کے کبھی اُس آشیاں کے ساتھ رہتا ہوں

مرے شعروں میں بھی اشعؔر اُسی کے غم کا پرتَو ہے
غزل کہتا ہوں لیکن نوحہ خواں کے ساتھ رہتا ہوں

مری طلب مری خواہش ہے سرخرو رہنا
اُسے پسند ہے میرا لہو لہو رہنا

یہ ناگزیز ہے خوش بختیء جنوں کے لیے
دہانِ زخمِ تمنا کا بے رفو رہنا

یہی بہت ہے سکونِ دل و نظر کے لیے
پسِ خیال سرِ شہرِ آرزو رہنا

اُسے یہ ضد کہ پسِ پردہء حجاب رہے
مری سرشت میں ہے محوِ جستجو رہنا

کبھی وہ عکسِ سرِ آئینہ مثال بھی ہو
ذرا سی دیر تو ممکن ہو روبرو رہنا

یہ مری عمر کا بھر پور استعارہ ہے
تلاشِ رزق میں سائل کا کو بکو رہنا

وہ کون ہے کہ مسلسل ہے جس کے آنے سے
دیارِ حسن میں وحشت کا چار سو رہنا

کوئی سنے نہ سنے داستانِ عرصہء جاں
تم اپنے آپ سے مصروفِ گفتگو رہنا

کرشمہ سازیء حُسنِ قیاس ہے اشعرؔ
خزاں کی فصل میں احساسِ رنگ و بو رہنا

مری تمثیل بھی تھا اپنا تماشہ ہی نہ تھا
وہ کہ اک شاخ سے ٹوٹا ہوا پتا ہی نہ تھا

اس کے چہرے پہ کوئی خول بھی ہو سکتا ہے
میں نے اُس شخص کے بارے میں یہ سوچا ہی نہ تھا

میں تو کہتا تھا کہ حالات بدل سکتے ہیں
وہ مری بات مگر غور سے سنتا ہی نہ تھا

اُس نے کس طرح شبِ عمر گذاری ہو گی
اُس کے گھر میں تو چراغِ رُخِ زیبا ہی نہ تھا

جس سے کچھ صورتِ تسکینِ نظر ہو سکتی
میرے ماحول میں ایسا کوئی چہرہ ہی نہ تھا

دیکھ اے قریۂ نو میری سلیقہ مندی
ایسے آباد ہوں جیسے کبھی اجڑا ہی نہ تھا

خون کے داغ بھی غائب ہیں گذرگاہوں سے
کالعدم سلسلۂ نقشِ کفِ پا ہی نہ تھا

اُس کے آنے سے یہ احساس ہوا ہے اشعرؔ
میرے آنگن میں کبھی چاند تو اُترا ہی نہ تھا

تسکین بھی دیتا ہے جلاتا ہے لہو بھی
اک شخص ہے جو راحتِ جاں بھی ہے عدو بھی

حالات ہی طوفان سے نسبت نہیں رکھتے
گردابِ بلا خیز ہے اس شخص کی خُو بھی

دِل کو ہدفِ تلخیء گفتار بنا کر
پھر سوزنِ مژگاں سے وہ کرتا ہے رفو بھی

دانستہ تبسم سے گریزاں ہوں کہ گھر میں
رہتا ہے مرے ساتھ وہ اک عربدہ جو بھی

جو کرب ہے مجھ میں مرے چہرے سے عیاں ہے
جھلساتی رہی ہے مجھے احساس کی لُو بھی

کچھ ایسے مسائل ہیں کہ اب صنفِ غزل میں
متروک ہوا تذکرہء جام و سُبو بھی

اشعر کبھی عشاق پریشاں نہیں ہوتے
کیا واقفِ آدابِ محبت نہیں تو بھی

ہیں تو اب بھی مگر بہت کم ہیں
کاسے کافی ہیں سر بہت کم ہیں

اِن دنوں رہگذارِ دانش میں
منزلوں تک سفر بہت کم ہیں

اب تو سورج بھی سوچتا ہوگا
قدر دانِ سحر بہت کم ہیں

جِن میں سچ مُچ کے لوگ رہتے ہوں
شہر میں ایسے گھر بہت کم ہیں

ایسے گھر بھی ہیں شہرِ خوباں میں
جِن کے دیوار و در بہت کم ہیں

اب یہ دُکھ بھی ہے رہ نوردوں کو
راستوں میں شجر بہت کم ہیں

لفظ مائل بہ مرگ ہیں اشعر
گفتگو کے اثر بہت کم ہیں

''ایک نوبیاہتا نوجوان سے گفتگو''

شادیاں اِس لئے ہوتی ہیں کہ ھنگامے بپا ہو جائیں

اور رشتے کا نیا پن کئی دیرینہ روابط کو شکستہ و کشیدہ کر دے

میری ماں کا بھی تو مجھ پر حق ہے

جسکی چھاتی کا لہو ''آبِ زم زم جسے کہیے تو مناسب ہوگا''

زندگی بن کے مرے جسم سے وابستہ ہے

میری شریانوں میں پیوستہ ہے

چلیئے بابا کا کوئی حق نہ سہی

پینشن ان کی کفالت کی ضمانت جو ہوئی

ہاں مگر، وہ جو معصوم سی ہمشیرائیں، جنکے قد سرو کی مانند مرے دوش تک آ

پہنچے ہیں

جنکی آنکھوں میں جدائی کی لکیروں نے مرے ہوش اڑائے رکھے ہیں

رحمتیں جن کے خدوخال سے وابستہ ہیں

جن کے ہونے سے مرے گھر میں بہار آئی ہے

رحمتوں سے تو کسی طور سبکدوش نہیں ہو سکتا

تا بہ کے وہ مرے پندار کے درپے ہوگی

اور کب تک مرا دِل نوچے گی

اب وہی ہوگا جو میں چاہوں گا

چاہے یہ رشتہءِ نو

جو مری تخریب پہ آمادہ ہے

قصہء پارینہ بنے

شادیاں اس لئے ہوتی ہیں

کہ

ھنگامے بپا ہو جائیں

سرحدِ جاں سے جو گذرے تو گذرنے دیجے
جسکو جینا نہیں آتا اُسے مرنے دیجے

اس قدر تیز نہ چلئے سرِ صحرائے طلب
ریت پر نقشِ کفِ پا تو اُبھرنے دیجے

کوئی تحریک تو ہو حفظِ رگِ جاں کے لئے
خلقتِ شہر کو حالات سے ڈرنے دیجے

اب اسے تیرگیء قیدِ بدن راس نہیں
خون کو دامنِ مژگاں پہ بکھرنے دیجے

اب مسافت میں جواں سالیء رفتار کہاں
کاروانِ غمِ ہستی کو ٹھہرنے دیجے

پھر کہیں اُس کی جسامت کا تعین ہوگا
پہلے قطرے کو سمندر میں اترنے دیجے

اُس کی گفتار پسندیدہء جاں ہے اشعر
وہ اگر طنز بھی کرتا ہے تو کرنے دیجے

یوں تذکرہء صورتِ حالات نہ کرنا
اب اُس کے حوالے سے کوئی بات نہ کرنا

اُلجھے ہوئے لہجوں سے وضاحت نہیں ہوگی
سہمے ہوئے لوگوں سے سوالات نہ کرنا

آہستہ سے دستک درِ دولت پہ بھی دینا
اصرار مگر بہرِ ملاقات نہ کرنا

وہ سامنے آئے تو تبسم ہو لبوں پر
چہرے کو سُپردِ غمِ اوقات نہ کرنا

شکوہ بھی اگر ہو تو بیک جنبشِ لب ہو
تا دیر مگر حرف و حکایات نہ کرنا

آجائے اگر کوئی شکن اُس کی جبیں پر
پھر زحمتِ اظہارِ غمِ ذات نہ کرنا

لفظوں کی تجارت تو مناسب نہیں اشعرؔ
جائز بھی نہیں صدقہ و خیرات نہ کرنا

روح وارفتۂ تکمیلِ طلب ہے سرِ خواب
اک سحر ہے کہ پسِ پردۂ شب ہے سرِ خواب

حیرت انگیز ہے یہ صورتِ ترغیبِ خیال
دِل کہ آماجگہء جشنِ طرب ہے سرِ خواب

جیسا چاہا تھا ہویدا ہے سرِ عرصۂ شب
جو نہ ہونے کی توقع تھی وہ سب ہے سرِ خواب

کل کہ تھی باعثِ تضحیکِ تمنائے طلب
اب وہ لکنت لبِ اظہار میں کب ہے سرِ خواب

محوِ حیرت ہوں کہ ایسا کبھی ممکن تو نہ تھا
وہ مرا تلخ نوا مہر بلب ہے سرِ خواب

میں وہاں ہوں جہاں ہونے کا گماں تک بھی نہ تھا
قریۂ نور میں ہونا بھی عجب ہے سرِ خواب

اب کبھی خواب سے بیدار نہ ہونا اشعرؔ
سر خوشی پھر یہ کہاں ہوگی کہ اب ہے سرِ خواب

سروں پر کیسی بوسیدہ ردا تانے ہوئے ہیں
ہوا کو گالیاں دیتے ہیں دیوانے ہوئے ہیں

دعائیں اس لئے بھی رائیگاں جاتی رہیں ہیں
کہ ہم اپنے تصوّر کو خدا مانے ہوئے ہیں

جنھیں دیوانگی حدِ ہوس تک لے گئی تھی
سرِ شہرِ نگاراں پھر سے فرزانے ہوئے ہیں

جو چہرے پھر سرِ محفل نمایاں ہو رہے ہیں
وہ سب کے سب ہمارے جانے پہچانے ہوئے ہیں

جو اپنی ذات کو سورج سے نسبت دے رہے ہیں
سفیرِ ظلمتِ شب ہیں یہ ہم جانے ہوئے ہیں

چراغوں کی لویں پردوں کے کونے چھورہی ہیں
مگر سب اہلِ محفل ہیں کہ پروانے ہوئے ہیں

انھیں انصاف کی مسند پہ لے جایا گیا ہے
جو اپنی آستیں کو خون سے سانے ہوئے ہیں

ہمیں اغیار سے اشعرؔ کوئی شکوہ نہیں ہے
مگر جو لوگ اپنے تھے وہ بیگانے ہوئے ہیں

تو ہی نہیں بدلا ہے بدل جائیں گے ہم بھی
تبدیلیء اوقات میں ڈھل جائیں گے ہم بھی

ہم ترکِ وفا میں تری تقلید کریں گے
گردابِ تمنا سے نکل جائیں گے ہم بھی

اب تیرے رویے سے یہ طے ہے کہ کسی دن
خونِ رگِ احساس اگل جائیں گے ہم بھی

تو بھی شبِ تنہائی کو محسوس کرے گا
آتش کدہء ہجر میں جل جائیں گے ہم بھی

کم فہم تھے جب تیری رفاقت میں رہے تھے
مائل بہ تفکر ہیں سنبھل جائیں گے ہم بھی

اب منحرفِ عہدِ وفا یہ نہ سمجھنا
عشاق کے پیرو ہیں بہل جائیں گے ہم بھی

اشعر مرے ہمدرد جہاں جاتے رہے ہیں
اس قریہء خاموش میں کل جائیں گے ہم بھی

سحر اور شام یکساں دیکھتا ہوں
در و دیوارِ زنداں دیکھتا ہوں

نشاطِ خواب سے نا آشنا ہوں
مگر خوابِ پریشاں دیکھتا ہوں

کسی منظر میں بھی سورج نہیں ہے
چراغاں ہی چراغاں دیکھتا ہوں

نئی سلوٹ درونِ آئینہ ہے
نئے چہرے کا عنواں دیکھتا ہوں

اگرچہ دھند گہری ہوگئی ہے
مگر تا حدِ امکاں دیکھتا ہوں

میں اُس کی خواہشوں سے باخبر ہوں
مگر پھر اپنا داماں دیکھتا ہوں

مسافت کا گماں ہوتا ہے اشعرؔ
جب اپنے گھر کا ساماں دیکھتا ہوں

غبارِ دشت پسِ کہسار اچھا لگا
فریبِ موسمِ بے اعتبار اچھا لگا

وہی ہے آج بھی مسند نشینِ بزم خیال
وہ ایک شخص جو بے اختیار اچھا لگا

سرِ خمیدہ و دستارِ سر حصار بدست
یہ انکسار سرِ کوئے یار اچھا لگا

امید و بیم سے یکساں رہے مراسمِ جاں
کبھی سکون کبھی انتشار اچھا لگا

ہمیں سکون میسّر تھا ریگِ صحرا پر
مگر اُسے شجرِ سایہ دار اچھا لگا

گراں تو گذری بہت مرگِ آرزو لیکن
ہمیں سکوتِ شبِ انتظار اچھا لگا

جوان ہاتھ میں اشعؔر تھا اک ضعیف کا ہاتھ
خزاں بدست خرامِ بہار اچھا لگا

پھر وہی وقت ہو، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے
تاج ہو تخت ہو؟ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے

تیرہ بختی کی کوئی حد بھی تو ہو سکتی ہے
پھر وہ خوش بخت ہو؟ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے

یہ بھی ممکن ہے کہ مُشکل مری حل ہو جائے
وہ تہی دست ہو؟ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے

فاصلہ کم ہی سہی سرِ حدِ جاں تک ، لیکن
یہ سفر سخت ہو؟ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے

وہ مسافر کہ بہت دور سے دیکھا ہے جسے
وہ بھی بے رخت ہو؟ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے

اجنبی شہر میں شاید کوئی غمخوار بھی ہو
رات بھر گشت ہو؟ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے

بستیاں بس تو گئیں ریگِ تپاں پر اشعرؔ
دشت پھر دشت ہو؟ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے

دامنِ قرطاس پر ہر واقعہ لکھتے رہے
جیسے ممکن ہو سکا جو بھی ہوا لکھتے رہے

کہنہ یادیں اِس حوالے سے ترو تازہ رہیں
زندگی کو سلسلہ در سلسلہ لکھتے رہے

عقل نے تفہیم کے احکام صادر کر دیئے
ہم خود اپنی لغزشوں کا فیصلہ لکھتے رہے

دوسروں نے جو کہا سُن تو لیا لکھا نہیں
جو ہمارے سامنے ہوتا رہا لکھتے رہے

خوف ایسا تھا کہ سب کچھ جاننے کے باوجود
ہم بھی اکثر راہ زن کو رہنما لکھتے رہے

دو ہی لفظوں پر رہی ہے مشتمِل طرزِ سخن
زندگی بھر آشنا نا آشنا لکھتے رہے

ایسی کیفیت بھی گذری ہے کہ اشعؔر رات بھر
اپنے دِل پر اسمِ پاکِ مصطفیٰؐ لکھتے رہے

قریہء جاں میں اک آشوبِ سخن آج بھی ہے
مجھ میں اُس شخص کے لہجے کی چُبھن آج بھی ہے

میرے اعصاب مسلسل اسی گرداب میں ہیں
اُس کے ماتھے پہ وہی ایک شکن آج بھی ہے

صورتِ حال وہی کچھ ہے جو آغاز میں تھی
میرے ماحول میں پہلی سی گھٹن آج بھی ہے

ہم نے جو پھول کھلائے تھے وہ شاداب سہی
پھر بھی اندیشہء تخریبِ چمن آج بھی ہے

میں نے پھولوں میں بھی محسوس کیا ہے اُس کو
شاخ در شاخ وہی حُسنِ بدن آج بھی ہے

دشت کو گھر تو بنایا ہے سرِ دست مگر
دِل اسیرِ ہوسِ سیرِ چمن آج بھی ہے

جو بھی گذری ہے سرِ دشتِ تمنّا اشعرؔ
اس کا اظہار پسِ پردہء فن آج بھی ہے

ہمارے گھر میں بھی دو چار دن گذارا کرے
عروسِ صبحِ بہاراں اگر گوارہ کرے

خدا نے اُس کو ۔ مرا ہمسفر بنایا ہے
قدم اُٹھانے سے پہلے جو استخارہ کرے

میں جوڑ جوڑ کے رکھوں متاعِ حسنِ غزل
وہ تند خُو مری محنت کو پارہ پارہ کرے

اُسے میں پھول سے تشبیہہ دوں وہ میرے لیے
سرشتِ خارِ کفِ پا کو استعارہ کرے

مفاہمت کے لئے شرط ہے کہ میری طرح
وہ اپنی ذات کے ابہام آشکارہ کرے

شبِ فراق کی شدت حریفِ جاں ہی سہی
علاجِ درد مگر صبح کا ستارہ کرے

میں اس امید پہ گذرا ہجوم سے اشعرؔ
کوئی تو ہو جو مری سمت بھی اشارہ کرے

اُس کی آنکھیں ہم نے دیکھیں نم بہت عرصے کے بعد
وہ ہمیں اچھا لگا تاہم بہت عرصے کے بعد

خار زارِ فکر میں کچھ پھول کِھلنے چاہییں
اس طرف مائل ہوئے ہیں ہم بہت عرصے کے بعد

مضمحل رہنے کی عادت خودبخود زائل ہوئی
ہم ہوئے ہیں پھر سے تازہ دم بہت عرصے کے بعد

منتشر ہونے لگی تحریکِ اندوہِ خیال
وقت نے چھیڑا ہے پھر سرگم بہت عرصے کے بعد

گُمشدہ تصویر کہنہ کاغذوں سے مِل گئی
پھر سے تازہ ہوگیا اک غم بہت عرصے کے بعد

رفتہ رفتہ بُجھ رہے تھے آخرِ شب کے چراغ
روشنی لیکن ہوئی ہے کم بہت عرصے کے بعد

ہم بھی اشعؔر مشتعل رہنے سے عاجز آگئے
اُس نے جب سر کو کیا ہے خم بہت عرصے کے بعد

کھنڈرات کو دیکھ کر

تو بھی فنکار ہے
تیرے ہاتھوں سے مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کے
سرِ راہ بکھرے ہوئے ٹھیکرے
نو با نو صورتوں سے مزیّن ہوئے ہیں
ان پہ ایسی بہت سی شبیہیں کہ جنکا
کسی نوعِ مخلوق سے کچھ تعلق، کوئی رشتہ نہیں ہے
کوئلے کے قلم سے ہویدا ہوئی ہیں
غالباً قبلِ تاریخ
تجھ ہی جیسے مصوّر
گھر کے دیوار و در پر
بہت سی شبیہیں کہ جنکا
کسی نوعِ مخلوق سے کچھ تعلق، کوئی رشتہ نہیں ہے
بناتے رہے ہیں
جسمِ انسان پر

پر سجاتے رہیں ہیں
ایک پیکر پہ دو چار چھ سر لگا کر
ہیئتوں کا تصوّر بڑھاتے رہے ہیں
میری تائید میں شہرِ برباد کے کھنڈروں سے
برآمد شدہ بت زباں بن گئے ہیں
کہ ہم،
گھر کے دیوار و در کی بہت سی شبیہوں کے ہمزاد ہیں
شہرِ برباد کے رفتگاں
سینکڑوں کیا ہزاروں برس تک
ہمیں اپنا خالق سمجھتے رہے ہیں

سلوکِ چارہ گراں ناروا عجیب سا ہے
اخیر عمر میں یہ تجربہ عجیب سا ہے

زباں پہ حرفِ شکایت نہ ہو کسی کے لئے
مری سرشت کا یہ فیصلہ عجیب سا ہے

ہمیں سلیقۂ عرضِ طلب نہیں رکھتے
یہ سوچنا پسِ قصدِ دعا عجیب سا ہے

کبھی کبھی وہ بڑی بے رُخی سے مِلتا ہے
مرا رفیق میرا آشنا عجیب سا ہے

میں اپنے آپ کو پہچاننے سے قاصر ہوں
کہ عکسِ رُخ بھی سرِ آئینہ عجیب سا ہے

یہ تذکرے کہ سحر اب کبھی نہیں ہوگی
شبِ طویل میں اک سلسلہ عجیب سا ہے

مجھے یقیں ہے کہ رستہ شناس وہ بھی نہیں
میں دیکھتا ہوں مرا رہنما عجیب سا ہے

کوئی سراب مرا منتظر نہ ہو اشعرؔ
خیالِ پیرویِ نقشِ پا عجیب سا ہے

طے کئے اُس نے صعوبت کے سفر اپنے لیئے
طالبِ خیر تو وہ بھی ہے، مگر اپنے لیئے

میرے بارے میں پریشان نہیں ہے وہ شخص
فکر لاحق ہے اُسے شام و سحر اپنے لیئے

اِن دنوں وہ بھی اُسی شخص کی تحویل میں ہے
ہم نے رکھا تھا جو اک کاسہء سر اپنے لیئے

ہم تہہِ دامِ فسوں کاریء ایام ، نہیں
ہم نے خود سوچ لئے ہیں کئی ڈر اپنے لیئے

ہم سے خود اپنے درو بام کی تخریب ہوئی
لوگ تعمیر کیا کرتے ہیں گھر اپنے لیئے

قد بڑھانے کے طریقے ہمیں تعلیم نہ کر
تو اگر حد سے گذرتا ہے گذر اپنے لیئے

یہ بہت ہے کہ چراغِ رُخِ زیبا اشعر
اب بھی روشن ہے پسِ پردہء در اپنے لیئے

زمیں لرزنے لگی ہے اگر کہیں ٹھہرے
صعوبتوں کی مسافت میں ہم نہیں ٹھہرے

دلِ حریص مچلتا رہا کہ ناقہء جاں
جہاں جہاں شجر آئے وہیں وہیں ٹھہرے

پھر اِس وجود کو ابہام سے نجات مِلے
دلِ شگاف زدہ میں اگر یقیں ٹھہرے

ہمی نے اس کے لئے پیراہن بنایا تھا
پھر اس کے بعد ہمی مارِ آستیں ٹھہرے

کبھی وہ آئے تو کوزہ بدست و خندہ بلب
مرے لئے سمِ قاتل بھی انگبیں ٹھہرے

ہمیں نصیب ہو کیسے کہ سرگراں جو ہوئے
وہ سجدہ گاہِ محبت جہاں جبیں ٹھہرے

ہر ایک لفظ پسندیدہء سماعت ہو
وہ بات کیجئے اشعر جو دِلنشیں ٹھہرے

بنتے ہیں خیالوں میں بھنور ایک ہی جیسے
درپیش ہیں ہر شخص کو ڈر ایک ہی جیسے

پتھرائے ہوئے سارے بدن ایک طرح کے
سوچوں سے تہی کاسہ ء سر ایک ہی جیسے

تاحدِ نظر شورشِ وحشت زدگاں سے
محرومِ بضاعت ہیں شجر ایک ہی جیسے

ہر نقشِ قدم سرخ ہے خونِ کفِ پا سے
بے سمت مسافت کے ثمر ایک ہی جیسے

اشجار پہ سب اپنے حوالوں سے جدا تھے
بکھرے ہوئے پتّے ہیں مگر ایک ہی جیسے

تبدیلیء اوقات نہیں ہے مرے گھر میں
اس قبر میں ہیں شام و سحر ایک ہی جیسے

اشعرؔ یا سرِ شام چراغاں ہو بہر سو
یا شہر میں تاریک ہوں گھر ایک ہی جیسے

خود سنو میری داستاں مجھ سے
اب ملو گے کہو؟ کہاں مجھ سے

وقت کے نو بہ نو مسائل نے
چھین لی ندرتِ بیاں مجھ سے

خواب میں طائرانِ دشت نورد
پوچھنے آئے آشیاں مجھ سے

سات پشتوں کی جو امانت تھا
چھٹ گیا وہ مرا مکاں مجھ سے

چھت سمجھتا ہوں آسمان کو میں
چھن نہ جائے یہ سائباں مجھ سے

میں کسی دوست کی تلاش میں تھا
ہو چکی سعیٔ رائیگاں مجھ سے

میرا دستِ طلب دراز نہیں
کیوں گریزاں ہیں مہرباں مجھ سے